تاثرات

(بسلسلۂ گزشتہ)

تبدیلیٔ نصاب کے بارہ میں قرآنِ حکیم کو تعلیم کا مدار و محور قرار دینے کے بعد دوسری اصولی بات یہ ہے کہ اس دور کے اجتماعی و انفرادی مسائل کے حل کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ ہمارے مدارس سے جو لوگ سندِ فضیلت لے کر نکلیں، ان کی دینی بصیرت تبحر اور اصابتِ رائے پر اعتماد کیا جا سکے۔ ان میں مسائل پر غور کرنے کی خُو پیدا ہو۔ ان میں مجتہدانہ صلاحیتیں اجاگر ہوں اور یہ اس لائق ہوں کہ زیرِ تحقیق مسائل میں ٹھوس اور متوازن موقف اختیار کر سکیں۔ متوازن کے معنی ہمارے نزدیک یہ ہیں کہ بحث و تحقیق کے دوران نہ تو یہ اپنے شاندار ماضی، اپنی درخشاں تہذیب اور اپنے فخر و ناز کے شایانِ شان روایات سے انحراف ہی کے مرتکب ہوں اور نہ یہ ہو کہ مسائل کے ان جدید پہلوؤں پر ان کی نظر نہ پڑے جن کو جدید سائنس اور ٹیکنالوجی نے سطحِ وجود پر ابھار دیا ہے۔ کیونکہ جو اجتہادی کاوشیں ماضی اور تاریخ کے جادہ سے ہٹ کر بروئے کار لائی جائیں گی وہ بے جان کھوکھلی اور اعتذار خواہانہ ہوں گی۔ اسی طرح اگر فکر و تدبر میں علوم و معارف کے نئے پہلو اور فوائد مدِنظر نہیں ہوں گے تو اس صورت میں رائے اور فیصلہ کی جو بھی شکل ہوگی اس کو عصرِ حاضر کے انسان کے لیے ماننا دشوار ہوگا۔

آج جس اشکال کا ہمیں شدت سے سامنا ہے وہ یہی تو ہے کہ کچھ بزعمِ خود غلط لوگوں نے اپنے فکر و اجتہاد کی اساس صرف ڈکشنری قرار دے رکھی ہے۔ ان کا نہ ماضی سے کوئی تعلق ہے اور نہ ان میں اس درجہ صلاحیت و استعداد ہی ہے کہ اسلامی علوم و معارف کا مطالعہ کر سکیں اور یہ دیکھ سکیں کہ ہمارے ہاں محدثین، فقہا اور کتاب و سنت کے ماہرین نے استدلال و استنباط کا کیا ذخیرہ چھوڑا ہے۔ کن بنیادوں کی نشاندہی کی ہے اور کس

ذوقِ خاص کی پرورش کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اسلام فضا میں تو نازل نہیں ہوا، بلکہ یہ ایک جیتی جاگتی قوم اور معاشرہ میں نازل ہوا ہے، جس کے اپنے عقائد، افکار اور تہذیبی سانچے تھے، جن کو وہ مانتے اور تسلیم کرتے تھے۔ اسلام نے ان عقائد و افکار کی اصلاح کی اور جاہلی معاشرہ کو توحید و رسالت کا نیا روپ اور نیا رنگ بخشا۔ جس سے یہ معاشرہ ایک نئے نظامِ حیات کو رواج دینے میں کامیاب ہوا۔ اور پھر یہ معاشرہ جو اسلام کے فیوض و برکات سے بہرہ مند ہوا، اس کی اپنی ایک تاریخ ہے، جس میں فکر و اجتہاد کے تمام دھاروں کا الگ الگ بیان ہے۔ اب اگر کوئی شخص بدقسمتی سے یہ نہیں دیکھتا کہ اسلام کے مخاطبینِ اولین نے اسلام کو کیونکر سمجھا۔ کس طرح اس کی تعلیمات کو عمل و کردار میں سمو کر دکھایا اور مسائل و مباحث میں فقہ و رائے کی وہ کون خصوصیات اور ادائیں ہیں جن سے انسانی معاشرہ یا اسلامی تاریخ عبارت ہے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اسلام کو اس کی معروضی اور تاریخی حیثیت میں سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔

ان کے برعکس کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو مسائل کے حل و کشود میں صرف ماضی ہی میں ڈوب کر رہ جاتے ہیں اور یہ نہیں جاننا چاہتے کہ زمانہ حال نے ان کے لیے علم و معرفت کی کیا روشنی مہیا کی ہے اور کن تہذیبی و ثقافتی نتائج اور مسلمات کے آگے اس دور کے انسان کو سرِ تسلیم خم کر دینے پر مجبور کر دیا ہے۔ یہ گروہ اس حقیقت سے آشنا نہیں ہے۔ کہ اسلام ہر دور اور ہر عہد میں قابلِ فہم ہے، قابلِ عمل ہے اور اس لائق ہے کہ تاریخ کے ارتقا کے ساتھ ساتھ چل سکے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس ذہنیت پر اصرار کرنے والا گروہ عہدِ جدید کے پروردہ ذہن کو ہرگز مطمئن نہیں کر سکتا۔ اس دوگونہ اشکال سے عہدہ برآ ہونے کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں:

۱۔ یہ کہ قرآن، حدیث اور فقہ کی تدریس کا اسلوب روایتی اور سطحی نہ ہو۔ بلکہ اس طرح کا محققانہ اور جامع ہو کہ اس سے طلبہ میں وسعتِ نظر اور اصابتِ رائے کا ملکہ پیدا ہو سکے۔

۲۔ انگریزی زبان کی تعلیم لازمی قرار دی جائے اور کوشش کی جائے کہ طلبہ کم از کم

سائنس کے مبادی و معطیات سے اچھی طرح روشناس ہو سکیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ طلبہ سوشل سائنسز (SOCIAL SCIENCES) سے واقف ہوں اور یہ جانتے ہوں کہ معاشرہ کیا ہے۔ اس کے عناصرِ ترکیبی کون کون ہیں۔ یہ کس طرح معرضِ ظہور میں آتا ہے اور وہ کون داخلی و خارجی عوامل ہیں جو اس پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ سیاسیات کیا ہے، اقتصادیات کے دائرہ میں کون کون مدرسہ ہائے فکر کا شمار ہوتا ہے اور یہ کہ ان میں کیا صحیح ہے اور کیا صحیح نہیں۔ یہی دو طریق ہیں جن کو آزمانے سے ہم ماضی و حال میں جو فاصلہ ہے اس کو کم کر سکتے ہیں

لیکن یہ اس وقت ہو سکے گا جب ہم درسِ نظامی کے ہفتخواں اور طویل و عریض نظامِ تعلیم پر نظرِ ثانی کریں اور غیر ضروری عناصر کو اس درجہ کم کر دیں کہ جدید مضامین کے لیے گنجائش نکل سکے۔

(محمد حنیف ندوی)

جامعہ اسلامیہ بہاول پور کے وائس چانسلر مولانا سید ابو بکر غزنوی کی وفات سے تعلیمی حلقوں میں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے۔ وہ مولانا سید داؤد غزنوی کے فرزند ارجمند تھے اور ایک اونچے خاندان کے سنجھے ہوئے فرد تھے۔

سید ابو بکر غزنوی بیک وقت کئی خوبیوں کے مالک تھے۔ نامور عالمِ دین، ماہرِ تعلیم بہترین استاد، اچھے مقرر، جدید سے باخبر، قدیم سے آگاہ اور روشن خیال انسان تھے۔ وہ بڑی محنت سے اپنے تدریسی فرائض سرانجام دیتے تھے اور طلبہ ان کے اندازِ تعلیم سے بہت متاثر تھے۔ طلبا میں علمی روح کے ساتھ ساتھ وہ ایک خاص اسلوب سے نیکی و صالحیت کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے کوشاں رہتے تھے اور نوجوان ذہن ان سے اثر پذیر ہوتے تھے۔ انھوں نے اپنی علمی و تدریسی زندگی کا آغاز اسلامیہ کالج لاہور کی لیکچررشپ سے کیا۔ پھر انجینیرنگ یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات کے استاد اور بعد ازاں اسی شعبہ کے صدر مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۵ء میں ان کی گوناگوں صلاحیتوں کی بنا پر انھیں جامعہ اسلامیہ بہاول پور کا وائس چانسلر بنا دیا گیا۔